ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 3921

Program: BS Islamic Studies (Spec. Seerat Studies)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کلیۂ عربی وعلوم اسلامیہ (شعبہ سیرت سٹڈیز)

کورس: عقیدہ وعلم الکلام (3921) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص سیرت سٹڈیز)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ 5-9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں؛ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل نہ کریں۔ اس گائیڈ میں دینی مباحث خالصتاً علمی اور تعلیمی انداز میں بیان کیے گئے ہیں؛ کسی فرد یا خاص واقعے پر کسی شرعی حکم کا اطلاق مستند علماء اور اہلِ اختیار کا کام ہے، اس لیے عملی راہنمائی کے لیے اہلِ علم سے رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: قضا و قدر اور مسئلہ جبر و اختیار

سوال نمبر 1: قضاء وقدر اور مسئلہ جبر واختیار کا مفہوم تحریر کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

تقدیر پر ایمان ارکانِ ایمان میں شامل ہے اور علمِ کلام کی تاریخ میں یہ مسئلہ ہمیشہ مرکزی مباحث میں رہا ہے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت و علم کی کاملیت کا تقاضا ہے کہ کائنات میں کچھ بھی اس کے علم و فیصلے سے باہر نہیں، اور دوسری طرف انسان کی اخلاقی ذمہ داری، ثواب و عذاب کا نظام اور امر و نہی کے احکام اس بات کے متقاضی ہیں کہ انسان اپنے اعمال میں کسی حد تک مختار بھی ہے۔ اسی کشمکش کو جبر و اختیار کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ اس جواب میں پہلے قضا و قدر کے مفاہیم بیان کیے جائیں گے، پھر جبر و اختیار کے تصورات اور اس مسئلے پر پیدا ہونے والے مکاتب کا مختصر جائزہ پیش کیا جائے گا اور آخر میں اہلِ سنت کے متوازن موقف کی وضاحت کی جائے گی۔

قدر کا مفہوم

قدر کے لغوی معنی اندازہ، مقدار اور تعین کے ہیں۔ اصطلاح میں قدر سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل سے ہر چیز کو اپنے علم کے مطابق مقرر و مقدر فرما دیا ہے؛ یعنی جو کچھ کائنات میں ہوا، ہو رہا ہے اور ہو گا، اللہ کو ازل سے اس کا کامل علم ہے اور اس نے اسے اپنے فیصلے و اندازے کے مطابق مقرر کر رکھا ہے۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کو کئی انداز سے بیان کیا گیا ہے، مثلاً یہ کہ اللہ نے ہر چیز کو ایک مقررہ اندازے کے ساتھ پیدا کیا (سورۃ القمر، آیت 49 کا مفہوم) اور یہ کہ زمین و آسمان کی کوئی مصیبت ایسی نہیں جو ایک کتاب میں درج نہ ہو (سورۃ الحدید، آیت 22 کا مفہوم)۔

قضا کا مفہوم

قضا کے لغوی معنی فیصلہ کرنا، حکم نافذ کرنا اور کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اصطلاح میں قضا سے مراد اللہ تعالیٰ کے ازلی فیصلے کا وقت آنے پر واقعاتی صورت میں ظاہر و نافذ ہو جانا ہے۔ اس فرق کو علما یوں بیان کرتے ہیں کہ قدر اللہ کے ازلی علم و تعین کا نام ہے اور قضا اس تعین کے خارجی وجود میں آنے کا نام ہے؛ ایک مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے نقشہ انجینئر کے ذہن و کاغذ پر پہلے بنتا ہے اور عمارت بعد میں وجود میں آتی ہے، اگرچہ اللہ کی ذات کے لیے انسانی مثال مکمل طور پر منطبق نہیں ہوتی۔ تقدیر کے مراتب

میں علما نے علم، کتابت، مشیت اور تخلیق کو بیان کیا ہے: اللہ کو ہر چیز کا علم ہے، اس نے لوحِ محفوظ میں سب کچھ لکھ دیا، جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اور ہر چیز کا خالق بھی وہی ہے۔

جبر کا مفہوم

جبر کے لغوی معنی زبردستی اور مجبور کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں جبر اس عقیدے کو کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں مکمل طور پر مجبور و بے اختیار ہے، اس کے افعال حقیقتاً اللہ ہی کے افعال ہیں اور انسان کی حیثیت ایک بے روح آلے سے زیادہ نہیں۔ اس نقطۂ نظر کو تاریخِ کلام میں جبریہ فرقے سے منسوب کیا جاتا ہے، جس کے نمایاں بانی کے طور پر جہم بن صفوان کا نام لیا جاتا ہے۔ جبر کے عقیدے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر انسان کو اس کے نیک و بد اعمال کی جزا و سزا دینا بے معنی ہو جائے، کیونکہ سزا و جزا کا تعلق اختیار سے ہوتا ہے۔ اسی کمزوری کی بنا پر جمہور اہلِ علم نے اس نظریے کو قبول نہیں کیا۔

اختیار و قدر کا مفہوم

اس کے بالمقابل اختیار و تفویض کا نظریہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خالق و مکمل مختار ہے اور اللہ کی قدرت و مشیت کا اس کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں۔ اس نظریے کو قدریہ اور بعد میں معتزلہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے دلائل میں یہ بات نمایاں تھی کہ اگر انسان مجبور ہو تو تکلیف و جزا و سزا کا نظام عدل کے خلاف ہو جائے گا۔ یہ نکتہ اپنی جگہ اہم تھا، مگر اس نظریے کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس سے انسانی اعمال اللہ کی تخلیق و مشیت سے باہر نکل جاتے تھے، جو توحید ربوبیت کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں سمجھا گیا۔ اس بنا پر اہلِ سنت نے دونوں انتہاؤں کے درمیان درمیانی راہ اختیار کی۔

اہلِ سنت کا موقف: کسب کا نظریہ

اہلِ سنت والجماعت کا متوازن موقف یہ ہے کہ تمام اعمال سمیت ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، مگر انسان اپنے ارادی اعمال میں ارادہ و اختیار رکھتا ہے اور اسی ارادے و انتخاب کو کسب کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید اس توازن کو یوں بیان کرتا ہے کہ انسان کے لیے وہی ہے جس کی وہ کوشش کرے (سورۃ النجم، آیت 39 کا مفہوم) اور دوسری طرف یہ بھی کہ

اللہ نے چاہا تو تم نہیں چاہ سکتے (سورۃ الانسان، آیت 30 کا مفہوم)۔ دونوں طرح کی آیات کو ملا کر پڑھنے سے یہی درج بالا موقف نکلتا ہے کہ تخلیق اللہ کی طرف سے ہے اور کسب و انتخاب کی نسبت انسان کی طرف صحیح ہے، اسی نسبت پر ثواب و عذاب مرتب ہوتا ہے۔

اسی موقف کی مزید وضاحت یوں کی جاتی ہے کہ انسان کے اندر جو ارادہ پیدا ہوتا ہے، اسے اختیار کرنا قبول کرنا اس کے بس میں دیا گیا ہے، جبکہ فعل کو وجود میں لانے کی قدرت اللہ کی عطا ہے۔ ہاتھ کی اضطراری حرکت اور ارادی حرکت میں جو فرق ہر انسان اپنے وجدان سے محسوس کرتا ہے، وہی اس بات کی سادہ دلیل ہے کہ انسان نہ مکمل مجبور ہے اور نہ مکمل خود مختار خالق۔ اسی لیے نصیحت، تعلیم، قانون اور جزا و سزا کے تمام نظام اسی درمیانی حقیقت پر قائم ہیں۔

جدول: جبر و اختیار پر تین بڑے مواقف

منسوب مکتب / تبصرہ	بنیادی دعویٰ	موقف
جبریہ (جہم بن صفوان)؛ جزا و سزا کے نظام پر اشکال پیدا ہوتا ہے	انسان مکمل مجبور ہے؛ اعمال کا حقیقی فاعل صرف اللہ ہے	جبر
قدریہ و معتزلہ؛ توحیدِ ربوبیت کے تقاضوں سے عدمِ مطابقت پر نقد ہوا	انسان اپنے اعمال کا خالق و مکمل مختار ہے	تفویض / قدر
اہلِ سنت والجماعت (اشاعرہ و ماتریدیہ) کا جمہوری موقف	خالق اللہ ہے، مگر انسان ارادہ و کسب کا حامل اور ذمہ دار ہے	کسب (درمیانی راہ)

تقدیر پر ایمان کے عملی اثرات

تقدیر کے عقیدے کا مقصد انسان کو بے عمل بنانا نہیں بلکہ اس کے اندر توکل، صبر اور شکر کی کیفیات پیدا کرنا ہے۔ کوشش و اسباب اختیار کرنا بھی شریعت کا حکم ہے اور خود تقدیر کا حصہ ہے؛ نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دینا انسان کو مایوسی اور گھبراہٹ سے بچاتا ہے۔ علما نے تنبیہ کی ہے کہ تقدیر کو گناہوں کے جواز کے طور پر استعمال کرنا اس عقیدے کی غلط تطبیق ہے، کیونکہ انسان عمل سے پہلے نہیں جانتا کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے، اس لیے اس پر حکم کی بنیاد رکھنا درست نہیں۔ اس نکتے کی تفصیل عقائد کی مستند کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ قدر اللہ کے ازلی علم و تعین کا نام ہے اور قضا اس کے وقوع و نفاذ کا؛ جبر و تفویض دونوں انتہائی مواقف ہیں جبکہ اہلِ سنت کا درمیانی موقف کسب کا نظریہ ہے، جس کے مطابق اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور انسان اپنے ارادی اعمال کا ذمہ دار فاعل ہے۔ یہ توازن توحید کی حفاظت بھی کرتا ہے اور اخلاقی ذمہ داری کی بنیاد بھی فراہم کرتا ہے۔

سوال نمبر 2: عقیدۂ آخرت اور علاماتِ قیامت

سوال نمبر 2: عقیدۂ آخرت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے قیامت کی صغریٰ و کبریٰ علامات لکھیں۔ (20 نمبر)

تعارف

عقیدۂ آخرت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ اس سے مراد موت کے بعد کی زندگی، قبر کے احوال، قیامت کے قیام، اعمال کے حساب و کتاب اور جنت و دوزخ کے ابدی انجام پر ایمان ہے۔ اس عقیدے کے بغیر انسانی زندگی کی اخلاقی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں، کیونکہ دنیا میں ہونے والی ناانصافیوں کا مکمل انصاف اسی ابدی زندگی میں ممکن ہے۔

اس جواب میں پہلے عقیدۂ آخرت کا مفہوم و اجزا بیان کیے جائیں گے اور پھر قیامت کی چھوٹی یعنی صغریٰ اور بڑی یعنی کبریٰ علامات کو روایات کی روشنی میں مرتب انداز سے لکھا جائے گا۔ تمام علامات کا بیان علمی و تعلیمی ہے؛ کسی علامت کو کسی خاص دور یا واقعے پر قطعی طور پر منطبق کرنا اور تاریخیں متعین کرنا اس جواب کا منہج نہیں ہے، کیونکہ غیب کا قطعی علم اللہ ہی کے پاس ہے۔

عقیدۂ آخرت کا مفہوم و اجزا

آخرت کے لفظی معنی بعد میں آنے والی زندگی کے ہیں۔ شرعی مفہوم میں اس سے مراد وہ پورا سلسلۂ احوال ہے جو موت سے شروع ہو کر ابدی زندگی تک جاتا ہے: عالمِ برزخ یعنی قبر کی زندگی، صور پھونکا جانا، محشر میں اٹھ کھڑا ہونا، نامۂ اعمال کا ملنا، میزان میں اعمال کا تولا جانا، پل صراط سے گزرنا اور بالآخر جنت یا دوزخ میں ابدی قیام۔ قرآن مجید نے اس عقیدے کو بار بار بیان کیا ہے؛ سورۃ البقرہ میں اہلِ ایمان کی صفات میں آخرت پر یقین کو نمایاں طور پر ذکر کیا گیا ہے (سورۃ البقرہ، آیت 4 کا مفہوم)، اور سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں بھی کامیاب مومنوں کی صفات کے ساتھ آخرت کے تصور کو جوڑا گیا ہے۔

اس عقیدے کی عقلی بنیاد یہ ہے کہ اللہ کی حکمت و عدل کا تقاضا ہے کہ ظالم و مظلوم، نیک و بد سب کو ان کے عمل کا پورا بدلہ ملے، جو اس فانی دنیا میں مکمل طور پر ممکن نہیں۔ اسی لیے قیامت کو جزا کا دن کہا گیا ہے۔ حدیثِ جبریل میں آخرت کے دن پر ایمان کو ارکانِ ایمان میں شمار کیا گیا ہے (صحیح مسلم کی روایت کا مفہوم)، جس سے اس عقیدے کا مرکزی درجہ واضح ہوتا ہے۔

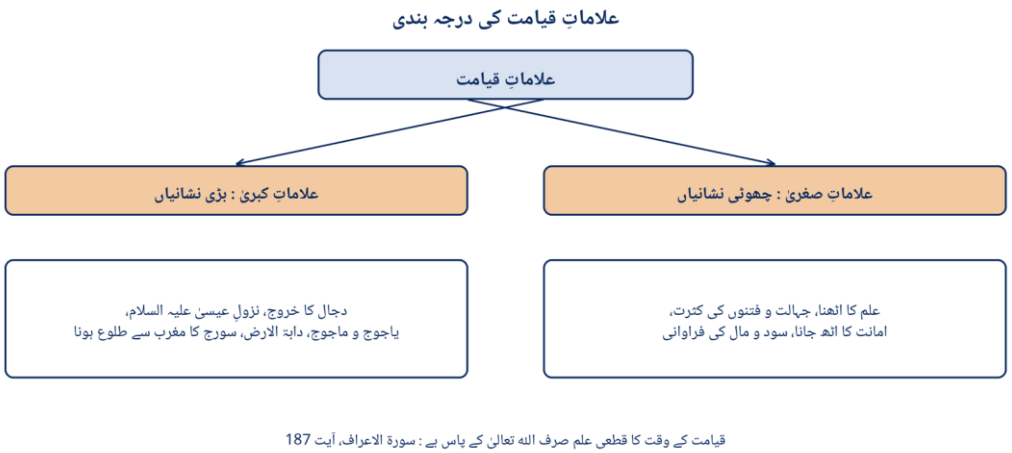
علاماتِ قیامت کی درجہ بندی

روایات میں بیان ہونے والی علامات کو علما نے عمومی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ علاماتِ صغریٰ وہ چھوٹی نشانیاں ہیں جو قیامت سے بہت پہلے بتدریج ظاہر ہوتی ہیں اور جن میں سے بہت سی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کے زمانے سے ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئیں۔ علاماتِ کبریٰ وہ بڑی نشانیاں ہیں جن کے ظاہر ہونے کے بعد قیامت قریب

آجائے گی اور دنیا کا نظام تیزی سے تبدیل ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہ درجہ بندی متعدد احادیث کے مجموعی مطالعے سے مرتب کی گئی ہے، جن میں صحیح مسلم کی وہ طویل روایت خاص طور پر اہم ہے جس میں دس بڑی علامات ایک ساتھ گنوائی گئی ہیں (صحیح مسلم، کتاب الفتن کی روایت کا مفہوم)۔

علاماتِ صغریٰ

چھوٹی علامات میں سب سے پہلی نشانی خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کا اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، کیونکہ روایت میں آپ نے اپنی بعثت اور قیامت کی قربت کو دو انگلیوں کے ساتھ سے تشبیہ دی ہے (صحیح بخاری و صحیح مسلم کی روایت کا مفہوم)۔ ان کے علاوہ روایات میں یہ علامات آئی ہیں: علم کا اٹھ جانا اور جہالت کا عام ہونا، زنا و شراب نوشی کا پھیلنا، سود کا عام ہونا، امانت کا اٹھ جانا اور نااہل لوگوں کو ذمہ داریاں ملنا، وقت میں برکت کم ہو جانا، قتل و فتنوں کی کثرت، عمارتوں کی اونچائی میں مقابلہ بازی، جھوٹ کا عام ہونا اور سچ کا نایاب ہونا، مال کی کثرت اور زکاۃ لینے والوں کی کمی کا زمانہ آنا، اور ماں باپ کی نافرمانی کا عام ہونا۔ یہ فہرست احادیث کے مجموعے سے مرتب کی گئی ہے؛ انفرادی روایات کی درجہ بندی اور ان کی تطبیق پر اہلِ علم کی بحثیں موجود ہیں، اس لیے طالب علم کو چاہیے کہ وہ اصل کتبِ حدیث اور مستند شروح کی طرف رجوع کی عادت ڈالے۔



قیامت کے وقت کا قطعی علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے : سورۃ الاعراف، آیت 187

شکل: علاماتِ قیامت—صغریٰ و کبریٰ

جدول: علاماتِ قیامت کی نمائندہ فہرست

زمرہ	نمائندہ علامات	ماخذ / مراجعہ
صغریٰ (اخلاقی و سماجی)	علم کا اٹھ جانا، جہالت، امانت کا اٹھ جانا، جھوٹ و فتنوں کی کثرت	صحیح بخاری و مسلم، کتاب الفتن و العلم
صغریٰ (معاشی و عمرانی)	سود و مال کی کثرت، اونچی عمارتوں میں مقابلہ	صحیح بخاری و مسلم کی روایات
کبریٰ	دجال کا خروج، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، یاجوج ماجوج	صحیح مسلم، کتاب الفتن
کبریٰ	دابۃ الارض، دھواں، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا	صحیح مسلم، کتاب الفتن
کبریٰ	تین بڑے خسوف (زمین دھنسنا)، یمن سے آگ کا نکلنا	صحیح مسلم، کتاب الفتن

علاماتِ کبریٰ

بڑی علامات میں روایات کے مطابق یہ امور شامل ہیں: مہدی کا ظہور، دجال کا خروج، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول، یاجوج و ماجوج کا نکلنا، دابۃ الارض کا ظاہر ہونا، آسمان پر دھویں کا چھا جانا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، تین بڑے خسوف یعنی مشرق، مغرب اور جزیرۂ عرب میں زمین کا دھنسنا، اور یمن کی طرف سے وہ آگ نکلنا جو لوگوں

کو محشر کی طرف ہانکے گی۔ صحیح مسلم کی مذکورہ روایت میں ان میں سے دس علامات ایک ترتیب سے گنوائی گئی ہیں۔ ان علامات کے ظہور کی رفتار کے بارے میں روایت میں یہ تصویر آئی ہے کہ یہ ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی طرح یکے بعد دیگرے ظاہر ہوں گی (سنن ترمذی و دیگر کتب کی روایات کا مفہوم)۔

ان علامات کی تفصیلات، خاص کر دجال کے فتنے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے واقعات، کتبِ فتن میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔ یہاں طالب علم کے لیے یہ اصولی بات اہم ہے کہ یہ سب امور غیب سے تعلق رکھتے ہیں؛ ان پر ایمان اجمالی مطلوب ہے، لیکن ان کی ایسی جزئی تطبیقات اور شخصی تعینات سے پرہیز کرنا چاہیے جن کی بنیاد قطعی نص پر نہ ہو۔ تاریخ میں قیامت کی تاریخ متعین کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی ہے، اور قرآن نے قیامت کے وقت کے علم کو اللہ کے ساتھ خاص قرار دیا ہے (سورۃ الاعراف، آیت 187 کا مفہوم)۔

عقیدۂ آخرت کے عملی اثرات

علامات کے بیان کا اصل مقصد خوف و دہشت پھیلانا نہیں بلکہ بیداری و تیاری ہے۔ عقیدۂ آخرت انسان کے اندر جوابدہی کا احساس پیدا کرتا ہے، اسے گناہوں سے روکتا اور نیکی پر آمادہ کرتا ہے۔ جو شخص یقین رکھتا ہو کہ اس کے ہر عمل کا حساب ہونا ہے، اس کی تجارت، ملازمت اور سماجی زندگی میں دیانت و انصاف نمایاں ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے آخرت کی تیاری کو اسبابِ دنیا چھوڑنے کے بجائے اعمالِ صالحہ جمع کرنے سے تعبیر کیا ہے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ عقیدۂ آخرت موت کے بعد کی زندگی سے لے کر ابدی انجام تک کے تمام مراحل پر ایمان کا نام ہے، اور قیامت کی علامات کو علما نے صغریٰ و کبریٰ دو درجوں میں بیان کیا ہے: چھوٹی علامات اخلاقی و سماجی تبدیلیوں کو ظاہر کرتی ہیں اور بڑی علامات دنیا کے نظام کی بڑی تبدیلی کی خبر دیتی ہیں۔ ان پر ایمان و یقین کے ساتھ لازم ہے کہ تاریخوں اور تطبیقات کی قیاس آرائی سے بچا جائے اور اصل توجہ اعمال کی تیاری پر رکھی جائے۔

سوال نمبر3: علمِ کلام کی تعریف، غرض وغایت اور ارتقائی مراحل

سوال نمبر3: علم الکلام کی تعریف، اس کی غرض وغایت اور ارتقائی مراحل بیان کریں۔(20نمبر)

تعارف

علمِ کلام اسلامی علوم میں وہ علم ہے جو عقائد کے اثبات و دفاع سے بحث کرتا ہے۔ یہ مسلمانوں کا واسطہ دوسری تہذیبوں و افکار سے پڑا اور خود مسلمانوں کے اندر مختلف فکری رجحانات پیدا ہوئے، تو عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کرنے اور اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت پیش آئی، جس سے یہ علم باقاعدہ صورت میں وجود میں آیا۔ اس جواب میں پہلے علمِ کلام کی لغوی و اصطلاحی تعریف بیان کی جائے گی، پھر اس کی وجہِ تسمیہ، اس کی غرض وغایت اور آخر میں اس علم کے ارتقائی مراحل کا تاریخی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

علمِ کلام کی تعریف

لفظ کلام کے معنی گفتگو اور بات چیت کے ہیں۔ اس علم کو علمِ کلام کہنے کی کئی وجوہات علما نے بیان کی ہیں؛ ایک مشہور وجہ یہ ہے کہ اس علم کے مباحث کا ایک بڑا عنوان اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام کا مسئلہ رہا ہے، دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس علم کے ماہرین اپنے مخالف سے گفتگو و مناظرے میں کمال رکھتے تھے، اور تیسری وجہ یہ کہ اس علم کی کتابوں کے ابواب کا آغاز عموماً کلام فی کذا یعنی فلاں مسئلے پر گفتگو سے ہوتا تھا۔ اصطلاحی تعریف امام غزالی اور دیگر متکلمین کی تحریروں کی روشنی میں یوں کی جا سکتی ہے: علمِ کلام وہ علم ہے جس کے ذریعے دینی عقائد کو یقینی دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے اور ان پر کیے جانے والے اعتراضات و شبہات کا ازالہ کیا جاتا ہے۔ عضد الدین ایجی جیسے متکلمین نے اس کی تعریف میں حجت و دلیل کے ساتھ عقائد کی تائید اور مخالفین کے رد کو مرکزی حیثیت دی ہے (المواقف فی علم الکلام کا مراجعہ)۔

موضوع کے اعتبار سے علمِ کلام کا موضوع اللہ کی ذات وصفات، نبوت، اور سمعیات یعنی وہ امور ہیں جن کا علم وحی سے حاصل ہوتا ہے، جیسے حشر ونشر اور جنت ودوزخ۔ مسئلہ کی نوعیت کے اعتبار سے یہ علم عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے نقلی دلائل کے ساتھ عقلی دلائل کو بھی استعمال کرتا ہے، اور یونانی منطق وفلسفے کے اسالیب سے بھی استفادہ اس علم کی تاریخ کا حصہ رہا ہے۔ اسی علم کو بعض اوقات اصول الدین، علم التوحید والصفات اور فقہِ اکبر کے ناموں سے بھی یاد کیا گیا ہے۔

علمِ کلام کی غرض وغایت

علمِ کلام کی غرض وغایت کو کئی نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ سب سے پہلی غایت عقائد کی صحت و درستی کا یقین حاصل کرنا ہے، تاکہ انسان تقلیدی ایمان سے آگے بڑھ کر تحقیقی معرفت تک پہنچے۔ دوسری غایت عقائد کا دفاع ہے، یعنی مخالف افکار کے اعتراضات کا علمی جواب دے کر عام مسلمانوں کے عقائد کو شبہات کی زد سے محفوظ رکھنا۔ تیسری غایت متشابہ نصوص کی درست تاویل وتشریح ہے، تاکہ نہ تشبیہ کی غلطی ہو اور نہ تعطیل کی۔ چوتھی غایت مذہبی مباحث میں اعتدال پیدا کرنا ہے، تاکہ تکفیر وتفسیق میں جلد بازی کے بجائے علمی قواعد کی پابندی ہو؛ اس باب میں بھی قطعی فیصلوں کا اختیار اہلِ علم وعدالت کے دائرے میں رہتا ہے۔ پانچویں غایت یہ ہے کہ طالب علم کے اندر دینی علوم کے لیے عقلی استدلال کی ترتیب وتربیت پیدا ہو۔ مشہور متکلمین نے اس علم کو علوم کا رئیس اس لیے بھی قرار دیا ہے کہ باقی دینی علوم کی بنیاد عقائد کی صحت پر قائم ہے۔

ارتقائی مراحل: ابتدائی دور

علمِ کلام کے ارتقاء کو عمومی طور پر چند ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور عہدِ نبوی وصحابہ کا ہے، جس میں عقائد براہِ راست وحی سے اخذ کیے جاتے تھے اور کلامی مباحث کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ دوسرا دور پہلی صدی ہجری کے اواخر کا ہے، جب تقدیر، ایمان اور بڑے گناہ کے مرتکب جیسے مسائل پر اختلاف پیدا ہوا اور خوارج، مرجئہ، قدریہ وجبریہ جیسے ابتدائی رجحانات سامنے آئے۔ اسی دور میں حسن بصری جیسی شخصیات کے حلقوں سے بھی علمی مباحث کا آغاز ملتا ہے۔ تیسرا مرحلہ معتزلہ کی باقاعدہ تنظیم کا ہے، جس میں واصل بن عطا اور عمرو بن عبید جیسی شخصیات کے نام نمایاں ہیں اور جنہوں نے پانچ اصولوں کی صورت میں ایک منظم کلامی نظام ترتیب دیا۔

ارتقائی مراحل: ترقی و عروج

چوتھا مرحلہ عباسی دور کا ہے، جب مامون کے عہد میں یونانی فلسفے و منطق کے تراجم بڑے پیمانے پر ہوئے اور کلامی مباحث میں فلسفیانہ اسالیب شامل ہو گئے۔ اسی دور میں خلقِ قرآن جیسے مسائل پر ریاست و علما کے درمیان کشمکش بھی اس علم کی تاریخ کا اہم باب ہے۔ پانچواں مرحلہ اہلِ سنت کے کلام کی تنظیم کا ہے، جس میں امام ابو الحسن اشعری نے معتزلہ سے علیحدگی کے بعد عقلی دلائل کو سنت کی تائید میں استعمال کرنے کا درمیانی راستہ اختیار کیا اور امام ابو منصور ماتریدی نے سمرقند میں اسی طرح کا نظام قائم کیا۔ ان دونوں شخصیات کے مکاتب نے علمِ کلام کو اس کی کلاسیکی صورت دی۔ چھٹا مرحلہ امام غزالی کا دور ہے، جنہوں نے منطق کو کلامی استدلال کا باقاعدہ آلہ بنایا اور فلسفے کے رد و قبول میں اعتدال کی مثال قائم کی۔

ارتقائی مراحل: بعد کے ادوار

بعد کے ادوار میں امام فخر الدین رازی جیسے متکلمین نے کلام و فلسفے کو مزید قریب کر دیا، جسے بعض ناقدین نے کلام کے فلسفیانے دور سے تعبیر کیا ہے۔ سعد الدین تفتازانی اور عضد الدین ایجی جیسے علما کی کتابیں صدیوں تک درسِ نظامی اور دیگر نصابوں میں پڑھائی جاتی رہیں، جن پر شروح و حواشی کا ایک عظیم سلسلہ وجود میں آیا۔ جدید دور میں علمِ کلام کو نئے چیلنجز کا سامنا ہوا، جن میں مادیت، الحاد، سائنسی اعتراضات اور مستشرقین کی تنقید شامل ہیں، اور معاصر علما نے انہی موضوعات پر جدید کلامی ادب کی تخلیق کی ہے۔ یہ ارتقائی جائزہ دکھاتا ہے کہ علمِ کلام ایک جامد نہیں بلکہ ہر دور کے سوالات کے جواب میں پروان چڑھنے والا زندہ علم ہے۔

جدول: علمِ کلام کے ارتقائی مراحل

نمایاں نام / مراجعہ	خصوصیت	مرحلہ
نصوصِ قرآن و سنت بطور ماخذ	عقائد براہِ راست وحی سے؛ کلامی بحث کی نوبت نہیں	عہدِ نبوی و صحابہ
حسن بصری کا حلقہ	تقدیر و ایمان کے مسائل؛ خوارج، مرجئہ، قدریہ کا	ابتدائی اختلافات (پہلی صدی ہجری)

	ظہور	
واصل بن عطا، عمرو بن عبید	پانچ اصول؛ عقلی استدلال کی باقاعدگی	اعتزال کی تنظیم
عباسی دور، مامون کا مہ	یونانی منطق و فلسفے کا داخلہ؛ خلقِ قرآن کا مسئلہ	تراجم و فلسفیانہ اثرات
ابوالحسن اشعری، ابو منصور ماتریدی	اشعری و ماتریدی مکاتب کی کلاسیکی صورت	اہلِ سنت کے کلام کی تنظیم
غزالی، رازی، تفتازانی؛ معاصر کلامی ادب	کلام و فلسفے کا امتزاج؛ جدید سوالات کا جواب	نضج و جدید دور

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ علمِ کلام دینی عقائد کو دلائل سے ثابت کرنے اور ان پر اعتراضات کا جواب دینے کا علم ہے؛ اس کی غایت ایمان کی تحقیق، دفاع اور اعتدال کی حفاظت ہے؛ اور اس نے اختلافی مسائل کے ابتدائی مباحث سے لے کر منظم مکاتب اور جدید مباحث تک ایک طویل ارتقائی سفر طے کیا ہے۔ اس تاریخ کی سمجھ رکھنے والا طالب علم عقائدی اختلافات کو وقتی جذباتی مسئلہ سمجھنے کے بجائے ان کے علمی پس منظر میں دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

سوال نمبر 4: اشاعرہ و ماتریدیہ کا فرق

سوال نمبر 4: اہل السنت والجماعت کے مکاتبِ فکر (اشاعرہ، ماتریدیہ) کا فرق واضح کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

اشاعرہ اور ماتریدیہ اہلِ سنت والجماعت کے دو بڑے کلامی مکاتب ہیں، جنہوں نے اسلام کے عقائد کو عقلی و نقلی دلائل سے منظم کیا اور معتزلہ و دیگر مکاتب کے اعتراضات کا جواب دیا۔ دونوں مکاتب کے اصول بنیادی طور پر مشترک ہیں اور ان کا اختلاف اکثر جزئی و اصطلاحی مسائل میں ہے۔ اس جواب میں پہلے دونوں مکاتب کا تعارف کرایا جائے

گا، پھر ان کے مشترک اصول بیان ہوں گے، اس کے بعد ان کے مابین معروف اختلافی مسائل کو جدول سمیت بیان کیا جائے گا اور آخر میں اس اختلاف کی نوعیت و حیثیت واضح کی جائے گی۔ یہ بیان خالص علمی ہے؛ ایک مکتب کے مقابلے میں دوسرے پر ترجیح یا تنقید کا قطعی فیصلہ اہلِ تخصص کا کام ہے۔

مکتبِ اشعری کا تعارف

اس مکتب کی نسبت امام ابو الحسن علی بن اسماعیل الاشعری (وفات 324ھ) کی طرف ہے، جو بصرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ابتدائی زندگی میں معتزلہ کے مشہور امام ابو علی جبائی سے تعلیم حاصل کی اور چالیس برس تک اسی مکتب سے وابستہ رہے، بعد میں آپ نے اس سے رجوع کر کے اہلِ سنت کے عقائد کی تائید عقلی دلائل سے کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ آپ کی مشہور کتب میں الابانہ اور مقالات الاسلامیین شامل ہیں۔ آپ کے نام سے منسوب متکلمین میں قاضی ابو بکر باقلانی، امام الحرمین جوینی، امام غزالی اور فخر الدین رازی جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں اور یہ مکتب خاص کر شافعی و مالکی حلقوں میں پھیلا۔

مکتبِ ماتریدی کا تعارف

اس مکتب کی نسبت امام ابو منصور محمد بن محمد الماتریدی (وفات 333ھ) کی طرف ہے، جن کا تعلق سمرقند کے قریب واقع بستی ماترید سے تھا۔ آپ فقہ میں امام ابو حنیفہ کے مکتب سے وابستہ تھے اور آپ نے وسط ایشیا میں اہلِ سنت کے عقائد کی تنظیم و دفاع کا کام کیا۔ آپ کی مشہور کتاب کتاب التوحید علمِ کلام کی بنیادی کتب میں شمار ہوتی ہے اور تاویلاتِ اہل السنہ آپ کی تفسیر ہے۔ آپ کے مکتب کے نمایاں ناموں میں ابو المعین نسفی اور سعد الدین تفتازانی شامل ہیں، اور یہ مکتب خاص طور پر حنفی دنیا، یعنی وسط ایشیا، برصغیر اور عثمانی علاقوں میں رائج رہا۔

مشترک اصول

دونوں مکاتب کے درمیان جو باتیں مشترک ہیں وہ ان کے اختلاف سے کہیں زیادہ اور اہم ہیں۔ دونوں اللہ کی ذات و صفات میں وحدانیت، صفاتِ الٰہی کا اثبات بغیر تشبیہ و تعطیل کے، قرآن کو اللہ کا کلام ماننا، نبوت و ختمِ نبوت، تقدیر، آخرت، شفاعت، عذابِ قبر اور ایمان کے بنیادی تصورات پر متفق ہیں۔ دونوں نے معتزلہ کے خلقِ قرآن، رویتِ باری

کی نفی اور وعد و وعید کے سخت موقف کی تردید کی۔ اسی مضبوط اشتراک کی وجہ سے صدیوں کے علمانے دونوں کو یکساں طور پر اہلِ سنت والجماعت کے دو بڑے مکاتب قرار دیا ہے اور دونوں کے مابین اختلاف کو فروعی علمی اختلاف شمار کیا ہے۔

معروف اختلافی مسائل

اختلافی مسائل میں سب سے مشہور مسئلہ ایمان کی تعریف کا ہے۔ ماتریدیہ کے نزدیک ایمان دل کی تصدیق کا نام ہے، اقرارِ زبان دنیاوی احکام کے اجرا کے لیے شرط ہے اور اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں۔ اشاعرہ میں بھی مشہور قول تصدیق ہی کا ہے، لیکن ان کے ہاں بعض تعبیرات میں اقرار و عمل کے درجے پر اختلاف پایا جاتا ہے اور ایمان کی زیادتی و کمی کے مسئلے میں اشاعرہ عموماً اثبات کی طرف مائل ہیں جبکہ ماتریدیہ ایمان کی ذات میں زیادتی و کمی کے قائل نہیں، البتہ اس کے نور و قوت میں فرق مانتے ہیں۔ دوسرا مشہور مسئلہ حسن و قبح کا ہے: ماتریدیہ کے نزدیک بعض افعال کی اچھائی برائی عقل سے بھی معلوم ہو سکتی ہے جبکہ اشاعرہ کے مشہور موقف میں حسن و قبح کا اصل ثبوت شریعت سے ہوتا ہے، عقل اس کی مستقل شارع نہیں۔

تیسرا مسئلہ تکلیف مالا یطاق کا ہے، یعنی ایسی تکلیف جو بندے کی طاقت میں نہ ہو: اشاعرہ کے نزدیک عقلی طور پر یہ ممکن ہے اگرچہ واقع نہیں، جبکہ ماتریدیہ اسے عقلی طور پر بھی نامناسب قرار دیتے ہیں۔ چوتھا مسئلہ اللہ کے افعال کی تعلیل کا ہے: ماتریدیہ کے نزدیک اللہ کے افعال حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتے، جبکہ اشاعرہ کے نزدیک اللہ کے افعال کو انسانی غایات کی تعلیل کا پابند قرار دینا درست نہیں، البتہ حکمت کے وجود کا انکار بھی نہیں۔ پانچواں مسئلہ کسب کی تعبیر کا ہے، جس میں دونوں فریق انسانی فعل کی نسبت و تخلیق کی باریکیوں میں مختلف تعبیرات اختیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ صفتِ تکوین کے مستقل صفت ہونے یا نہ ہونے میں بھی دونوں مکاتب کی تعبیرات مختلف بیان کی جاتی ہیں: ماتریدیہ تکوین کو ایک مستقل ازلی صفت مانتے ہیں، جبکہ اشاعرہ اسے صفتِ قدرت کے تعلقات میں شامل سمجھتے ہیں۔

جدول: اشاعرہ و ماتریدیہ کے نمایاں اختلافات

مسئلہ	اشاعرہ کا موقف	ماتریدیہ کا موقف

بعض صورتوں میں عقل سے بھی اچھائی برائی معلوم ہو سکتی ہے	اصل ثبوت شریعت سے؛ عقل مستقل شارع نہیں	حسن و قبح
ایمان کی ذات میں زیادتی و کمی نہیں؛ قوت و نور میں فرق ہے	عموماً زیادتی و کمی کا اثبات	ایمان میں زیادتی و کمی
عقلی طور پر بھی درست نہیں	عقلی طور پر جائز، اگرچہ واقع نہیں	تکلیفِ مالایطاق
افعال حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتے	اللہ کے افعال انسانی عایات کے پابند نہیں	افعالِ الٰہی کی تعلیل
مستقل ازلی صفات میں سے ایک صفت	قدرت کے تعلقات میں سے ایک	صفتِ تکوین
حنفی حلقے، وسط ایشیا، برصغیر، عثمانی علاقے	شافعی و مالکی حلقے، عرب و افریقہ کے بڑے علاقے	جغرافیائی غلبہ

اختلاف کی نوعیت و حیثیت

ان اختلافات کی نوعیت سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ اختلافات اصولِ دین کے بنیادی مسائل میں نہیں بلکہ ان کی تعبیر، دلیل کی ترتیب اور جزئی تطبیقات میں ہیں۔ اسی لیے علما نے اس اختلاف کو تنوع و تعبیر کا اختلاف قرار دیا ہے اور دونوں مکاتب کے پیروکار صدیوں سے ایک دوسرے کو اہلِ سنت میں شمار کرتے آئے ہیں۔ طالب علم کے لیے درست روش یہ ہے کہ وہ ان مسائل کو ان کی اصل کتب سے سمجھے، اختلاف کو علمی ادب کے ساتھ بیان کرے اور اسے باہمی منافرت کا ذریعہ نہ بنائے۔ کسی مسئلے میں راجح و مرجوح کا فیصلہ دلائل کے گہرے مطالعے کے بعد اہلِ علم کا کام ہے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اشاعرہ وماتریدیہ اہلِ سنت کے دو عظیم کلامی مکاتب ہیں جن کے بنیان گزار امام ابوالحسن اشعری اور امام ابو منصور ماتریدی ہیں۔ دونوں کے اصول مشترک ہیں اور ان کا اختلاف حسن و قبح، ایمان کی زیادتی و کمی، تکییفِ مالا یطاق، تعلیلِ افعال اور تکوین جیسے چند جزئی مسائل میں ہے۔ یہ اختلاف اہلِ سنت کے اندر علمی تنوع کی مثال ہے، تفرقے کی دلیل نہیں۔

سوال نمبر 5: واجب الوجود اور صفاتِ متشابہات کا حکم

سوال نمبر 5: واجب الوجود کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی صفاتِ متشابہات کا حکم بیان کریں۔ (20 نمبر)

تعارف

وجودِ باری تعالیٰ کا اثبات علمِ کلام و فلسفے کی سب سے بنیادی بحث ہے اور اس کا مرکزی تصور واجب الوجود ہے۔ اسی طرح نصوص میں آنے والی وہ صفات جن کے ظاہری مفہوم سے مخلوق سے مشابہت کا وہم پیدا ہو سکتا ہے، متشابہات کہلاتی ہیں، اور ان کے بارے میں درست منہج اختیار کرنا عقیدے کی سلامتی کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس جواب میں پہلے واجب الوجود کی تعریف اور اس کا ممتنع الوجود و ممکن الوجود سے فرق بیان کیا جائے گا، پھر اثباتِ واجب الوجود کے دلائل کا خلاصہ پیش ہو گا، اور اس کے بعد صفاتِ متشابہات کا مفہوم اور ان کے بارے میں اہلِ سنت کے مناہج بیان کیے جائیں گے۔

واجب الوجود کی تعریف

متکلمین و فلاسفہ نے وجود کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ واجب الوجود وہ ہستی ہے جس کا وجود اس کی ذات کا تقاضا ہو، اس کے عدم کا تصور محال ہو اور وہ اپنے وجود میں کسی علت و سبب کی محتاج نہ ہو۔ ممکن الوجود وہ ہے جس کا وجود و عدم دونوں ممکن ہوں اور وہ اپنے وجود کے لیے کسی مرجح و خالق کا محتاج ہو، جیسے پوری مخلوق کائنات۔ ممتنع الوجود وہ ہے

جس کا وجود محال ہو، جیسے ایک ہی وقت میں ایک چیز کا ہونا اور نہ ہونا۔ اس درجہ بندی کی رو سے اللہ تعالیٰ واحد واجب الوجود ہے؛ وہ ازلی و ابدی ہے، نہ اس کی ابتدا ہے اور نہ انتہا، اور باقی ہر چیز ممکن الوجود ہے جو اسی کی تخلیق سے وجود میں آئی ہے۔

اثباتِ واجب الوجود کے دلائل کا خلاصہ

کائنات کی ہر چیز ممکن الوجود ہے، کیونکہ وہ پیدا ہوتی ہے، بدلتی ہے اور فنا ہو جاتی ہے۔ ممکن اپنے وجود کے لیے مرجح کا محتاج ہوتا ہے؛ اگر مرجحوں کا سلسلہ غیر متناہی چلتا رہے تو یہ تسلسل لازم آئے گا جو عقلاً محال ہے، اور اگر سلسلہ دائرے کی صورت اختیار کرے تو دور لازم آئے گا، وہ بھی محال ہے۔ لہٰذا سلسلے کو ایک ایسی ہستی پر ختم ہونا ضروری ہے جو خود کسی کی محتاج نہ ہو، یعنی واجب الوجود۔ یہی دلیل مختلف صورتوں میں برہانِ امکان و وجوب کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کی حادث ہونے سے بھی اس کے محدث کے وجود پر استدلال کیا جاتا ہے، جسے دلیلِ حدوث کہا جاتا ہے اور متکلمین نے اسے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ دلائل یہاں خلاصہ کے طور پر ذکر کیے گئے ہیں؛ ان کی کامل صورتیں کلام کی مطول کتابوں میں موجود ہیں۔

متشابہات سے مراد

ایسے نصوص جن میں اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے الفاظ آئے ہیں جن کے ظاہری و لغوی معنی مخلوق کی صفات سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں، انہیں صفاتِ خبریہ یا متشابہات کہا جاتا ہے۔ ان کی مشہور مثالیں وہ آیات و احادیث ہیں جن میں اللہ کے لیے مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا لفظی ترجمہ انسانی اعضاء و کیفیات کی طرف ذہن لے جا سکتا ہے۔ قرآن نے خود خبر دی ہے کہ اس کی بعض آیات محکم ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور بعض متشابہ ہیں، اور علم میں پختہ لوگ اللہ کی طرف سے ہونے کی بنا پر ان سب پر ایمان لاتے ہیں (سورۃ آلِ عمران، آیت 7 کا مفہوم)۔ یہی آیت اس پورے مسئلے کی بنیاد ہے۔

متشابہات کے بارے میں مناہج

تاریخِ کلام میں ان نصوص کے بارے میں چند بڑے مناہج سامنے آئے ہیں۔ پہلا منہج سلف کا طریقِ تفویض و اثبات ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نصوص میں آئی صفات کو اسی طرح مانا جائے کہ وہ اللہ کے لیے ثابت ہیں، ان کی کیفیت اللہ کے سپرد کی جائے اور ان کو مخلوق کی صفات جیسا بھی نہ سمجھا جائے؛ یہی بغیر تشبیہ و تعطیل کے درمیانی راہ ہے۔ امام مالک سے منقول مشہور قول کا مفہوم اسی منہج کی ترجمانی کرتا ہے کہ [illegible] معلوم ہے، کیفیت نامعلوم ہے، اس پر ایمان واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا درست روش نہیں۔ اس منہج کے پیروکار صفات کا انکار بھی نہیں کرتے اور اعضاء و جوارح کا اثبات بھی نہیں کرتے۔

دوسرا منہج خلف کے بعض علما کا طریقِ تاویل ہے، جس میں ان الفاظ کی ایسی تشریح کی جاتی ہے جو اللہ کی تنزیہ کے مطابق ہو، مثلاً بعض الفاظ کو قدرت، نعمت یا غلبے کے مفہوم میں لینا۔ اس تاویل کے حامیان کا کہنا ہے کہ یہ تاویل اس وقت کی جاتی ہے جب ظاہری مفہوم عقلی قطعی دلیل سے متصادم ہو اور زبان میں اس تاویل کی گنجائش موجود ہو۔ تیسرا موقف ان فرقوں کا ہے جو دو انتہاؤں پر ہیں: مشبہہ نے ظاہری مفہوم کو مخلوق جیسا مان لیا، جس سے تجسیم لازم آیا، اور معطلہ نے صفات کا کلی انکار کر دیا، جس سے نصوص کی تعطیل لازم آئی۔ اہلِ سنت نے ان دونوں انتہاؤں کو رد کر کے اثبات مع التنزیہ کا درمیانی منہج اختیار کیا ہے۔

اہلِ سنت کا حکم و خلاصۂ منہج

اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک ان صفات کا حکم یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے اسی طرح ثابت ہیں جس طرح نصوص میں آئی ہیں؛ ان پر ایمان لانا واجب ہے؛ ان کی کیفیت بیان کرنا یا انھیں مخلوق کی صفات پر قیاس کرنا درست نہیں؛ اور اللہ کو ہر نقص و مشابہت سے پاک ماننا بھی لازم ہے، جیسا کہ قرآن نے فرمایا ہے کہ اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے (سورۃ الشوریٰ، آیت 11 کا مفہوم)۔ یہ آیت ایک ہی سانس میں اثبات و تنزیہ دونوں کو جمع کر دیتی ہے، اس لیے یہ اس مسئلے کی جامع ترین رہنما ہے۔ اشاعرہ و ماتریدیہ دونوں مکاتب اسی اصولی حکم پر متفق ہیں؛ فرق صرف بعض جزئی صفات میں تاویل کے اختیار کرنے یا نہ کرنے کی حدود میں ہے، جس کی تفصیل پچھلے سوال میں اشارۃً گزر چکی ہے۔

عملی طور پر طالب علم کے لیے اس مسئلے میں سلامتی کی راہ یہ ہے کہ وہ نصوص پر ایمان رکھے، متشابہات کی کھوج میں غیر ضروری گہرائی میں نہ جائے، اور جہاں تشریح کی ضرورت ہو وہاں مستند شروح و تفاسیر کی طرف رجوع کرے۔ غیب و صفات کے مسائل میں اپنے ذاتی قیاس سے کوئی صورت متعین کر لینا نہ سلف کا طریقہ ہے اور نہ اہلِ علم کی روش۔ اسی اعتدال کا نام اہلِ سنت کے منہج کی روح ہے۔

جدول: متشابہات کے بارے میں مناہج کا خلاصہ

حیثیت / تبصرہ	خلاصہ	منہج
اہلِ سنت کا مشہور مسلک	صفات ثابت ہیں، کیفیت اللہ کے سپرد، تشبیہ و تعطیل نہیں	تفویض مع الاثبات (سلف)
اہلِ سنت کے ایک حلقے کا اختیار کردہ طریقہ	تنزیہ کے موافق تشریح، جہاں قطعی دلیل تقاضا کرے	تاویل (بعض خلف)
اہلِ سنت کے نزدیک مردود انتہا	صفات کو مخلوق جیسی مان لینا	تشبیہ و تجسیم
اہلِ سنت کے نزدیک مردود انتہا	صفات کا کلی انکار	تعطیل

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ واجب الوجود وہ ہستی ہے جس کا وجود اس کی ذات کا لازمہ ہے اور اس سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جبکہ تمام مخلوق ممکن الوجود ہے۔ صفاتِ متشابہات کے بارے میں اہلِ سنت کا حکم اثبات مع التنزیہ ہے: صفات مانی جائیں، کیفیت اللہ کے سپرد کی جائے، نہ تشبیہ ہو اور نہ تعطیل۔ یہی اعتدال توحیدِ صفات کی حفاظت کا درست منہج ہے۔